(۱) کتاب المصباح المضئ فی کتاب النبی الامی و رسلہ الی ملوک الارض من عربی و عجمی :

اس کے مصنف آٹھویں صدی ہجری کے محمد بن علی بن احمد بن حدیدۃ الانصاری ہیں۔ ۷۷۳ھ میں تصنیف سے فارغ ہوئے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم کاتبوں اور ۳۴ قاصدوں کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد مراسلات نبوی کا متن ہے دنیا میں اب تک اس کتاب کے صرف تین نسخوں کا پتہ چلا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔ ایک پیرس کی امپیریل لائبریری میں اور ایک پٹنہ میں عجیب و غریب مخطوطہ ہے دیکھتے ہی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

(۲) جداول النورانیہ فی استخراج الآیات القرآنیہ :۔ اس کتاب کو اورنگ زیب عالمگیرؒ کے لئے ناصر بن حسین الحسنی والحسینی النجفی نے ترتیب دیا تھا۔ سرنگاپٹم کے سقوط کے بعد جب سلطان ٹیپو شہید کے محل میں لوٹ مچی ہے تو یہ مخطوطہ سلطان کے پلنگ پر تکیہ کے پاس رکھا ہوا ملا تھا۔

(۳) القواعد لبدر الدین الزرکشی :۔ یہ فقہ شافعی میں قانون کی ڈکشنری ہے

(۴) روزنامچہ مولوی عبدالوہاب مدارالامراء بہادر المتوفی ۱۲۸۵ھ اس میں چار تاریخیں ہیں (۱) ہجری (۲) ایرانی (۳) عیسوی (۴) ٹامل

(۵) مولوی محمد غوث صاحب نے ایک ضخیم کتاب "نثر المرجان فی رسم نظم القرآن" کے نام سے لکھی تھی: یہ کتاب عرصہ ہوا چھپی تھی یہاں اس کتاب کا اصل مسودہ مصنف کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈالنے سے پتہ چلا کہ مصنف نے اولاً اس کا نام "نثر الریحان" تجویز کیا تھا۔ بعد میں رائے بدل گئی تھی۔

وقت کی تنگی کے باعث دل پر انتہائی جبر کر کے ایک بجے کے قریب کوکن صاحب اور میں یہاں سے روانہ ہوئے اور سیدھے یونیورسٹی پہنچے۔ یہاں کی لائبریری میں علوم مشرقیہ کے مخطوطات کا ایک الگ مگر نہایت وسیع سکشن ہے۔ لائبریرین کی اجازت لے کر اس میں گھس گئے۔ فارسی میں فیضی کے ترجمۂ مہابھارت کا نہایت خوبصورت اور مرصع مخطوطہ اور طب میں کفایۃ الاطباء کا ضخیم مخطوطہ دیکھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں سنسکرت۔ ٹامل تلیگو اور پالی کے اسّی ہزار مخطوطات موجود تھے جو تیوں یا درخت کی چھالوں پر لکھے ہوئے مکمل طور پر محفوظ تھے اور ایک کمرہ میں دو تین پنڈت اڈیٹنگ ورک کر رہے تھے۔ یہاں سے رخصت ہو کر میں ہوٹل آیا اور کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر قیلولہ کیا۔

زنانہ کالج میں میری انگریزی تقریر | پروگرام کے مطابق ابھی چار بجے تھے کہ کوکن صاحب تشریف لے آئے اور ہم دونوں

آئی۔ ای۔ ٹی وومین کالج پہنچے۔ اس کالج کی عمر ابھی صرف بارہ برس ہے لیکن اس کا شمار مدراس کے اعلیٰ درجہ کے
ں میں ہوتا ہے۔ بشیر احمد سعید صاحب ان کے بانی اور ان کی بیگم صاحبہ اس کے چیئرمین ہیں، لڑکیوں کی تعداد دو ہزار
ہو اور استانیاں ایک سو دس ہیں جن میں تین سو لڑکیاں اور ۳۶ استانیاں مسلمان ہیں، کالج پر اب تک ساٹھ لاکھ روپیہ
چ ہو چکا ہے۔ اور اس رقم میں ۹۷ فی صد مسلمانوں کا حصہ ہے جن میں عرب ممالک کے فرماں روا اور ملیشیا و سنگاپور
رزندانِ اسلام بھی شامل ہیں۔ بلڈنگ کے ایک خاص حصہ میں (اسمبلی ہال کے قریب) سنگ مرمر کی تختیوں پر ان معطی
ات کے نام کندہ ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔ ساڑھے چار بجے ایک وسیع اور کشادہ
میں جلسہ شروع ہوا۔ مرد تو لے دے کے صرف چار تھے۔ پورا ہال معلمات و متعلمات سے بھرا ہوا تھا گویا "طوطی
شش جہت سے مقابل ہے آئینہ" پہلے ایک طالبہ نے قرأت کی۔ پھر بانی کالج نے میرے متعلق ایک تعارفی تقریر
اب میں کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کی۔ یہاں مسلمان لڑکیاں تو اردو سمجھتی اور کچھ بول بھی لیتی ہیں۔ لیکن بیرونی ملکوں
اور مقامی غیر مسلم لڑکیاں نہیں سمجھتیں اور بشیر سعید صاحب نے پہلے سے کہہ بھی دیا تھا۔ اس لئے تقریر انگریزی زبان میں
جو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ شروع میں میں نے کہا "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کیا ہے؟ کیونکہ بدقسمتی
ہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کو مغرب اور مشرق نے غلط سمجھا ہے۔ غیر مسلموں نے اور حد یہ ہے کہ بہت سے
سلمانوں نے اسے غلط سمجھا ہے۔ اس کے بعد ایمان و عمل کے سیاق میں حکمت نظری اور حکمت عملی پر روشنی ڈال کر
بت کیا کہ حضور کس طرح رحمت عالم اور اسلام ایک دینِ فطرت ہیں، بشیر سعید صاحب کم کسی کی تعریف کرتے ہیں۔
ن جب میں تقریر کر کے بیٹھا تو انھوں نے بڑے متاثرانہ انداز میں مصافحہ کیا اور فرمایا Moving and
fine spee (حرکت انگیز اور عمدہ تقریر) جلسہ برخاست ہوا تو بشیر سعید صاحب مجھے دروازہ کے
برابر لے کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک معلمہ نکلتی جاتی تھی اور وہ ان کو مجھ سے متعارف کراتے جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی
ہوئی کہ دیکھنے میں یہ نوعمر لڑکیاں سی تھیں لیکن سب کی سب کوئی ایم۔ اے کوئی ایم۔ ایس سی اور سائنس اور آرٹس
میں پی۔ ایچ ڈی سے بھی کم نہیں اس کے بعد ایک ہال میں اسٹاف کے ساتھ عصرانہ کا انتظام تھا جو بہت پرتکلف
اور باسلیقہ تھا۔ اس سے بھی فراغت ہو گئی تو بشیر سعید صاحب نے کالج کی عمارتیں۔ کلاس رومز۔ لیبوریٹریز
ہاسٹل۔ آڈیٹوریم۔ سوئمنگ پول۔ کھیل کے میدان۔ لائبریری۔ ریڈنگ روم۔ کامن روم کچن۔ ڈائننگ ہال
یستوران۔ اکزامنیشن ہال۔ دفاتر۔ سِک روم (بیمار گھر) یہ سب چیزیں اطمینان اور تفصیل سے دکھائیں۔ ہر بلڈنگ

اور ہر عمارت تک سب سے درست ٹپ ٹاپ ۔ ماڈرن طریقہ کی اور بہترین فرنیچر سے آراستہ لڑکیوں اور اُستانیو
کا لباس بہت سادہ نہ کنگھی چوٹی نہ کسے کساتے نیم عریاں بلاؤز اور نہ مانگ نہ سیندور ۔

کالج میں ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب مسجد بھی ہے جو سوا لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہو
اس کا ساز و سامان بھی اعلیٰ قسم کا ہے وضو کے لئے بہت سے نل لگے ہوئے ہیں جن میں پانی قریب ہی ایک
بڑا کنواں ہے اُس سے مشین کے ذریعہ پہنچتا ہے ۔ میں نے عصر اور مغرب دونوں وقت کی نماز اسی مسجد میں ادا
جب عصر کی نماز پڑھی تھی تو دیکھا تھا کہ مسجد میں کچھ لڑکیاں نماز پڑھ رہی تھیں اور کچھ تلاوت قرآن میں مصروف تھ
مغرب کے وقت ایسا ہوا کہ میں نے امامت کی اور اس وقت میرے پیچھے بشیر سعید صاحب ۔ کوکن صاحب
عبد السبحان عظمی صاحب جو کالج میں دینیات کے استاد ہیں ۔ یہ تین حضرات تھے ۔ لیکن سلام پھیرا تو دیکھا دو صف
خواتین کی بھی تھیں چلتے اور گھومتے پھرتے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور میں تھک سا گیا تھا اس لئے میں نے
بشیر سعید صاحب نے فرمایا "یہ تو ابھی کالج کی صرف ایک منزل دیکھی ہے ۔ بالائی منزل پر تو گئے بھی نہیں" میں
"باقی آیندہ" اب ہم کار میں روانہ ہوئے ۔ مجھے اس وقت کوکن صاحب کے ساتھ ان کے مکان پر عشائیہ
تھا ۔ اس لئے بشیر سعید صاحب ہم دونوں کو "زندان یوسف" پر اُتار کر گھر چلے گئے ۔ یہاں کوکن فیملی سے ملاق
کر کے ایسی ہی خوشی ہوئی جیسی کہ ایک ہفتہ کے بعد اپنے گھر کا سا کھانا اور بھنی ہوئی جھینگا مچھلی شامی کباب اور

دوسرے دن یعنی ۱۲ ستمبر جو مدراس میں میرے قیام کا آخری دن تھا اس کا پروگرام اس طرح شروع ہوا کا
صاحب صبح نو بجے میرے ہوٹل پہنچ گئے ۔ ان کے ساتھ انجمن حمایت اسلام کا یتیم خانہ جس کے موصوف صدر
اسے دیکھا ۔ اس میں دو سو لڑکے اور لڑکیاں رہتے ہیں ۔ قیام و طعام ۔ تعلیم ۔ مذہبی تربیت اور صنعتی تر
ان سب کا خاطر خواہ بندوبست ہے ۔ لیکن عمارت بوسیدہ ہے ۔ تعمیر کا کام برسوں سے رکا پڑا تھا ۔ اب پھر
ہوا ہے ۔ انجمن کی ملکیت میں نہایت وسیع قطعات زمین ہیں فنڈ نہ ہونے کے باعث یوں ہی پڑے ہوئے
اسے دیکھ کر یہاں سے فارغ ہو کر "دی نیو کالج" پہنچے ۔ یہ کالج جنوبی ہند کے مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا قا
ہے ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا ، اور ۵۸ء سے مدراس کا فرسٹ گریڈ کالج بن گیا ۔ آرٹس اور سائنس کے تمام
کی تعلیم ہوتی ہے ۔ اس میں بھی ایک خوبصورت اور شاندار مسجد بنی ہوئی ہے ۔ مسلمان طلباء کی تعداد
ہے ۔ گذشتہ سال تک اس کے پرنسپل ہمارے فاضل دوست مولانا سید عبد الوہاب بخاری تھے ۔ موجودہ

پال کرشن صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھیں سخت افسوس ہوا کہ پہلے سے خبر نہ ہوئی ورنہ میری تقریر کراتے۔
کالج۔ کلاس روم۔ لیبورٹریز۔ ہوسٹل۔ لائبریری سب گھوم پھر کر خوب دیکھیں۔ پرنسپل کے
ہیں مسلمان لیڈروں اور ہندو رہنماؤں کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح کا شاندار فوٹو دیکھ کر نگاہ ٹھٹک
رہ گئی۔ انتظام سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ جدید مینجنگ کمیٹی میں نو ممبر ہیں اس میں پرنسپل
عہدہ کے اعتبار سے ممبر ہیں ان کے علاوہ سب مسلمان ہی ہیں۔ بشیر سعید صاحب بھی ایک ممبر ہیں
ہیں تھک گیا تھا۔ ایک بجے کے قریب بشیر سعید صاحب نے مجھے میرے ہوٹل پہنچا دیا اور چونکہ مجھے
سرے دن صبح ہی واپس ہونا تھا اس لئے میں نے ان سے رخصت لی اور اُن کی عنایتوں کا شکریہ
کیا موصوف کے عزم وہمت اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر دل پر بڑا اثر ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق
م جنوبی ہند کے سرسید کہلاتے تھے بشیر سعید صاحب انھیں کے اسکول کے آدمی اور ان کے رفیق
ہیں۔ اس لئے اگر مولوی صاحب مرحوم واقعی اس نواح کے سرسید تھے تو بشیر سعید صاحب
بی ہند کے یقیناً "محسن الملک" ہیں۔

جمالیہ میں میری عربی تقریر اور مذاکرہ

ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی۔ قیلولہ کیا۔ یہاں
شام کے پانچ بجے کے قریب وعدہ کے مطابق کوکن صاحب تشریف لے آئے ہم دونوں بازاروں
رتے کراتے مغرب کے بعد مدراس سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے پیرمبور ٹکسی کے ذریعہ
پہنچے۔ یہاں جنوبی ہند کا مشہور مدرسۂ جمالیہ ہے۔ اور اس کے سامنے ہی سیٹھ جمال محی الدین رہتے ہیں۔
صاحب دیرینہ قومی کارکن اور ممبر پارلیمنٹ ہیں سنٹرل وقف کونسل نئی دہلی کی اسلامی تعلیمی کمیٹی
ہیں چیرمین ہوں اُس کے ممبر بھی ہیں چند ماہ سے قلب کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ پہلے ہم دونوں سیٹھ صاحب
س گئے۔ ان کی عیادت کی وہ دیر تک علالت کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری
لانا محمد علی کی باتیں سُناتے رہے۔ یہاں سے اُٹھے تو مدرسۂ جمالیہ پہنچے۔ خیال تھا کہ پانچ دس منٹ
درسہ دیکھ کر واپس ہو جائیں گے لیکن وہاں مدرسہ کے دو فاضل اساتذہ محمد غزالی الجمالی اور محمد
فع الباقوی سے ملاقات ہو گئی بس پھر کیا تھا؟ ان حضرات نے طلباء کو جو سب وہیں رہتے
ردی پانچ دس منٹ کے اندر اندر سب طلباء کمرہ میں جمع ہو گئے اور ایک جلسہ مرتب ہو گیا۔

مدرسہ جمالیہ اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ ہے۔ اس کی حیثیت درجۂ تکمیل کی ہے۔ دو برس کا دا[illegible] فنون کی اعلیٰ کتابوں کا درس ہوتا ہے۔ بیس طلباء اور تین اساتذہ اس کی کل کائنات ہے۔ بلڈ[illegible] شاندار ہے مسجد۔ مدرسہ اور ہوسٹل سب ایک ساتھ ہے۔ غالب اکثریت ملیشیا۔ سنگاپور اور د[illegible] ممالک کے طلباء کی ہوتی ہے۔ یہاں کی زبان عربی ہے۔ درس و تدریس۔ بات چیت۔ تحریر و تقر[illegible] کچھ عربی میں ہوتا ہے۔ مدراس یونیورسٹی سے اس کا الحاق ہے۔ اب باتوں باتوں میں نشست [illegible] جلسہ کی شکل اختیار کرلی تو پہلے دو ملیشیائی طالب علموں نے نہایت مؤثر انداز میں تلاو[ت] قرآن کی۔ پھر کوکن صاحب نے میرے تعارف میں عربی میں تقریر کی۔ اور اس کے بعد طلباء کے ا[صرار] پر میں نے عربی میں اساتذۂ کرام و طلباء کو خطاب کیا۔ جس میں عربی زبان و ادب کی اہمیت اور [اس] کے جدید تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ تقریر کے آخر میں میں نے طلباء سے کہا کہ یہ بہتر ہوگا کہ آپ [لوگ] مجھ سے کچھ علمی سوالات کریں اور میں جواب دوں۔ طلباء یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مختلف [موضوعات] فقہ۔ ادب۔ معاشرت سے متعلق سوالات کئے اور میں جواب دیتا رہا۔ اس طرح کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ [تک] کا یہ سلسلہ قائم رہا اور طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ دیر کافی ہو گئی تھی اس لئے اب ہم واپس ہو[ئے] لیکن مولانا محمد عبدالباری اور مولانا عبدالوہاب بخاری جو میرے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں اُن [سے] ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ بخاری صاحب تو مدراس میں ہی نہیں تھے اور مولانا محمد عبدالباری کو میر[ی] [illegible]

اگلے دن یعنی ۱۳ ر کی صبح کو میرے منع کرنے کے باوجود محب عمیم مولانا محمد یوسف صاحب کوکن آٹھ بجے ہی پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ میں ایر انڈیا کے دفتر میں آیا۔ دفتر سے کوچ ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہونے لگی تو کوکن [صاحب] کی غیر معمولی عنایتوں اور کرم گستریوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوا ½ ۹ بجے جہاز نے [پرواز] کی اور ٹھیک بارہ بجے یعنی ڈھائی گھنٹہ میں دلی میں پالم پہ پہنچا دیا اور یہ سفر دہ روزہ ختم ہوا۔

عجیب بات ہے کہ جنوبی ہند کی فضا یہاں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فرقہ وارانہ تعصب اور [illegible] کے باعث ہر وقت دماغ پر جو بوجھ رہتا ہے اس کا ان دنوں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ [illegible] ماشاءاللہ خوش حال ہیں تعلیم یافتہ اور اپنے مسائل سے خوب باخبر ہیں۔ اسلامی جماعت کہ تبلیغی جماعت دونوں [اچھے طریقے] سے کام کر رہی ہیں مسلمانوں میں تعمیری کاموں کے انجام دینے کی بڑی صلاحیت ہے۔ بڑی جرأت و ہمت اور دو[illegible]

عربی تنقید پر یونانی اثرات کا تحقیقی جائزہ

جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی
ایم اے، بی ٹی، ایچ (علیگ)
لکچرر شعبہ عربی، ونکیٹشور یونیورسٹی۔ آندھرا پردیش

چوتھی صدی ہجری میں عربی تنقید میں دو مکاتب فکر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ عربوں کی ادبی تنقید میں ایک رجحان تو وہ ہے جو ہم کو آمدی کے یہاں ملتا ہے اور جس پر ارسطو کی مترجمہ کتابوں کے اثرات نہیں پائے جاتے یا بہت ہلکے ہیں اس کے برعکس قدامہ بن جعفر کا طرزِ فکر عام عرب ناقدوں سے بالکل جدا نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں کے پاس ادبی تنقید کا سرمایہ تھا اور انھوں نے شکل وہیئت کی تنقید میں بلاشبہ غیر معمولی تنقیدی اصول مرتب کر لئے تھے چنانچہ خالص عربی خیالات کو عربی تنقید میں بہت سے ناقدوں نے پیش کیا ہے جن میں ہم ابن قتبہ، ابو العباس ثعلب، اسامہ ابن منقد ابن طباطبا علوی، ابن سلام اور آمدی کا نام لے سکتے ہیں۔ ان ناقدوں نے ارسطو کی کتابوں سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ آمدی نے باوجود کچھ متاثر ہونے کے ان اثرات کے خلاف ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں قدامہ کے نظریات کو رد کیا تھا مگر وہ اب نایاب ہے۔ بعد کے ناقدوں میں ابن سنان خفاجی بھی عرب ناقدوں کی صف میں قدامہ بن جعفر کے نظریات کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔

تیسری صدی ہجری ہی سے عربی تنقید پر یونانی اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں جوں جوں زمانہ بڑھتا ہے یہ اثرات بھی جڑ پکڑتے جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے عربی تنقید میں نظریاتی پہلو کا اضافہ ہوا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے عربوں کے پاس شکل و ہیئت کی تنقید کے پیمانے تھے مگر وہ نظریاتی تنقید سے واقف نہ تھے۔ تیسری صدی سے چوتھی صدی تک ارسطو کی دو کتابوں کے ترجموں نے عربوں کی تنقید پر بھرپور اثرات مرتب کیے پہلی کتاب الخطابت ہے۔ (RHETORIC) اور دوسری کتاب کتاب الشعر ہے (POETICS) ان تراجم کی تفصیل تو بعد میں آئے گی مگر اس موقع پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ کتابیں تیسری صدی [illegible] میں منتقل ہو چکی تھیں اور ان کے اثرات نمایاں ہو چلے تھے چنانچہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور کتاب الحیوان میں ارسطو، افلاطون اور اقلیدس وغیرہ کے نام ملتے ہیں اور ان کے خیالات پر ہلکا سا اثر بھی موجود ہے[1]۔ جاحظ کے بعد پھر ابن معتز کے یہاں کتاب الخطابت کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ ابن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے کتاب البدیع لکھ کر عربی تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا لیکن سوال یہ ہے کہ علم بدیع کا ماخذ کیا ہے؟ اس لیے کہ اس سے قبل اس موضوع پر عربی میں کوئی کتاب تصنیف نہ کی گئی تھی۔ ڈاکٹر محمد مندور نے لکھا ہے کہ ابن معتز نے جو علم بدیع کے پانچ ارکان بیان کیے ہیں ان میں سے چار ارسطو کی کتاب سے ماخوذ ہیں اور دونوں کی بیان کردہ تعریفات میں کوئی فرق نہیں یعنی طباق، جناس، استعارہ اور رد الاعجاز علی ما تقدمها مذہب کلامی کے بارے میں خود ابن معتز ہی نے لکھ دیا ہے کہ یہ انھوں نے جاحظ سے اخذ کیا ہے۔

ابن معتز نے استعارہ کی تعریف یہ کی ہے کہ "استعارة الكلمة لشئ يعرف بها من شئ قد عرف بها" یعنی کسی چیز کی تعریف کے لیے کسی دوسری چیز سے ایسا کلمہ مستعار لینا جس سے وہ معروف ہو تقریباً یہی تعریف ارسطو نے ان الفاظ میں کی ہے کہ استعارہ کسی نام کو دوسرے

---

[1] کتاب الحیوان ۳ ایضاً جاحظ ج ۱ ص ۸۷ (مرتبہ عبدالسلام ہارون)۔

کی جانب منتقل کرنا ہے[1]

اس مثال سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابن معتز نے ارسطو کی تعریفات کو پوری طرح سمجھ کر عربی میں منتقل کیا ہے۔ کتاب البدیع ارسطو سے ایک اور سطابقت ملتی ہے وہ یہ کہ جس طرح ارسطو نے بعض مثالیں پیش کر کے ان پر تنقید کی ہے بالکل اسی طرح ابن المعتز نے بھی کیا ہے[2]

ابن معتز کی ترجمہ کی ہوئی تعریفات آئندہ عربی تنقید کی بنیادیں ثابت ہوئیں۔ اس سلسلہ میں ان کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مذکورہ تعریفات پر استشہاد قرآن وحدیث اور عربی کی جدید وقدیم شاعری سے کیا ہے اور اس طرح کہ ان کو عربی قالب پہنا دیا اور یہی وجہ ہے کہ ابن معتز کی اصطلاحوں سے عرب زیادہ مانوس ہیں اور انھوں نے ان میں کوئی اجنبیت محسوس نہ کی۔ اگر کہیں قدامہ اور ابن معتز کی اصطلاحوں میں تضاد ہوا ہے تو عربوں نے قدامہ کے بجائے ابن معتز کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ ایک ہی اصطلاح کا ترجمہ دونوں کے یہاں مختلف ہو جاتا ہے مثلاً ابن معتز جس کو طباق کہتے ہیں قدامہ اس کا نام "المتکافی" رکھتے ہیں

ابن معتز کے یہاں یونانی اثرات چھپے ڈھکے انداز میں نظر آتے ہیں مگر اس کے بعد جو ناقد آتے ہیں ان کے یہاں یہ اثرات نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں چنانچہ قدامہ بن جعفر، اسحاق بن ابراہیم، ابوہلال عسکری، قاضی جرجانی اور عبد القاہر جرجانی نظریاتی تنقید کی تشکیل وتکمیل کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں یونانی خیالات سے روشنیٔ فکر ونظر حاصل کرتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے اب ہم تمام اہم عرب ناقدوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابن المعتز کے بعد قدامہ بن جعفر سامنے آتا ہے اور اس کی کتاب "نقد الشعر" میں یونانی نظریات پوری وضاحت کے ساتھ ہمیں نظر آتے ہیں۔ قدامہ نے پہلی بار عربی تنقید کو مرتب انداز

---

[1] DEPOETICA, KANSLATED.BY INGRAM BY WATER, OXFORDP.1457-B

[2] النقد المنہجی عند العرب مولفہ ڈاکٹر محمد مندور ص ۵۸۔

میں پیش کیا اور تنقید کے مسائل کو بڑے سلیقہ اور گہری فکر کے ساتھ عربوں سے متعارف کرایا قدامہ سے پہلے جتنی کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں نظریاتی بحثوں کا کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا نقدالشعر اس لحاظ سے پہلی کتاب ہے جس میں تنقید کا مطالعہ سائنٹفک انداز سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے بعد کے سارے ناقدوں کو متاثر کیا اور سب نے اس سے خوشہ چینی کی مگر بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قدامہ کے بعد استفادہ تو ہر ایک نے اس کی کتاب سے کیا لیکن اس کی تعریف میں ایک جملہ بھی کہنا کسی نے گوارا نہ کیا اس سے عربوں کا یہ تعصب صاف جھلکتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے بارے میں غیر عربی نظریات کی تعریف میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اس بات کو بہت برا سمجھتے ہیں کہ ان کے ادب کو کسی دوسرے ادب کا خوشہ چیں کہا جائے حتیٰ کہ جدید عرب ناقدین میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو یونانی اثرات کا بالکل منکر ہے اور کتاب الشعر و کتاب الخطابت کے اثرات کا عربی تنقید پر سرے سے انکار کرتا ہے چنانچہ محمد مندور اپنی کتاب "النقد المنہجی عند العرب" میں قدامہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہ بڑا اچھا ہوا کہ قدامہ کی کتاب نے عربی تنقید کو بہت زیادہ متاثر نہیں کیا اور قدامہ کی جو کچھ بھی خصوصیت ہے وہ اصطلاحات کے وضع کرنے تک محدود ہے اور جن لوگوں نے قدامہ کی تقسیماتِ بلاغت کو اختیار کیا ہے وہ آمدی اور جرجانی جیسے لوگ نہیں ہیں بلکہ علمار بلاغت ہیں جو ان سے متاثر ہوئے ہیں"[1]

تعجب ہوتا ہے کہ محمد مندور ابن المعتز کی اس لئے تعریف کرتے ہیں کہ انھوں نے اہلِ یونان سے متاثر ہو کر اصطلاحات وضع کیں لیکن اسی بات کو قدامہ کے یہاں پا کر سخت برہم ہو جاتے ہیں۔

ان متعصب ناقدین کے برعکس طٰہٰ حسین جو ان سے زیادہ صاحب فن اور حقیقت پسند ہیں وہ صاف لکھتے ہیں کہ شروع ہی سے عرب ناقدین نے قدامہ کی تعریف میں بخل کیا ہے حالانکہ تمام ناقدوں نے بلا استثناء اس کی کتاب "نقد الشعر" سے نظریات اخذ کئے ہیں[2]

قدامہ بن جعفر عرب ناقدین کی صف میں مظلوم نظر آتا ہے مگر اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کی کتاب نے سب سے زیادہ عربی تنقید کو متاثر کیا اور واقعہ یہ ہے کہ کتاب البدیع سے نہیں بلکہ

---

[1] النقد المنہجی عند العرب ص ۷۰۔ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ نقد النثر از طٰہٰ حسین۔

نقد الشعر سے عربی تنقید میں ایک نئی روح بیدار ہوتی ہے اور ابن المعتز کی طرح اس کتاب کا دائرہ محض اصطلاحات تک محدود نہیں رہتا بلکہ قدامہ ان اصطلاحات کو پیش کرنے کے علاوہ بہت سے تنقیدی مسائل بھی پیش کرتے ہیں اور بہت سے تنقیدی نظریات سامنے لاتے ہیں پھر اگر یہ قدامہ کے لیے عیب ہے کہ انھوں نے ارسطو سے کسب فیض کیا تو آخر یہی خوشہ چینی ابن المعتز کے لیے کیسے جائز ہو جاتی ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا تفصیل سے قدامہ کی کتاب نقد الشعر سے ان مسائل کا ذکر کروں جنھوں نے بلاشبہ تمام عرب ناقدوں کو متاثر کیا ہے اور پھر ان ناقدوں کا ذکر کروں گا جنھوں نے قدامہ سے کسب فیض کیا ہے۔

قدامہ نے ایسا نہیں کیا کہ ارسطو کے نظریات اور مثالوں کو من وعن نقل کر لیا ہو جس طرح بعد میں ابن سینا نے بحیثیت شارح کے کیا بلکہ انھوں نے ان نظریات کو جو ارسطو سے اخذ کئے انھیں عربی مثالوں سے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ انھیں پڑھنے سے کسی اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے پہلے قدامہ شعر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ وہ موزوں ومقفی قول ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے اگرچہ اس تعریف کا تعلق ارسطو سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر وہ شعر کے چار عناصر کا ذکر کرتے ہیں یعنی لفظ، وزن، قافیہ اور معنی پھر انھیں عناصر کو ایک دوسرے سے ملا کر چار مرکب شکلیں پیش کرتے ہیں یعنی لفظ کو معنی کے ساتھ لفظ کو وزن کیساتھ معنی کو وزن کے ساتھ معنی کو قافیہ کے ساتھ پہلے چار مفردات کا قدامہ تفصیلی ذکر کرتے ہیں پھر چاروں مرکبات کا۔ قدامہ نے پہلے ان اقسام کی مستحسن قسمیں بیان کی ہیں پھر وہ عیوب بتائے ہیں جن سے شعریت مجروح ہوتی ہے۔ کتاب کی تفصیلات میں جانے سے بہتر ہے کہ اب میں ان مسائل کو ترتیب وار بیان کر دوں جو قدامہ سے قبل عربی تنقید میں موجود نہ تھے۔ اور بعد میں انھیں تمام ناقدوں نے قبول کر لیا۔

معانی کی بحث میں قدامہ نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو تمام عرب ناقدین نے بالاتفاق قبول کر لیا ہے معنی کی خوبی قدامہ نے یہ بتائی ہے کہ اس کو مقصد کے مطابق ہونا چاہیے جبکہ معانی بے شمار ہیں

تو وہ ان کو مدح، ہجو، نسیب، مراثی، وصف اور تشبیہ میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر ہر قسم کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ساری اصناف شاعری کو مدح و ہجو کے تحت لانا چاہتے ہیں مرثیہ ان کے نزدیک مدح میں شامل ہے دونوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ مدح میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اور مرثیہ میں ماضی کا۔ اسی طرح غزل کو مدح میں شمار کرتے ہیں اور غزل کے الفاظ و خیالات کی رعایت پر زور دیتے ہیں۔ یہ خیالات ارسطو کے نظریہ سے عبارت ہیں[1]

دوسرا اہم نظریہ یہ ہے کہ بہترین مدح وہ ہے جس میں انسان کے فضائل کا بیان ہو ان صفات کو وہ چار صفتوں میں منحصر سمجھتے ہیں یعنی عقل، شجاعت، عدل اور عفت پھر تفصیل سے انسان کی تمام اہم صفات کا انھیں کو مرجع قرار دیتے ہیں۔ اس نظریہ کو عرب ناقدوں نے پوری طرح اپنا لیا ہے صرف آمدی نے اسے قبول نہیں کیا جس کا ذکر کر کے ڈاکٹر مندور لکھتے ہیں کہ اسطرح قدامہ نے شاعر کو جسمانی صفات کے بیان سے محروم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ عرب شعراء غزل میں کمر کا بیان نہیں کر سکتے قدامہ کی مذکورہ تعریف کے مطابق[2]۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ اگر اس جدید دور میں شاعر محبوب کی کمر کے بیان سے محروم رہ جائے تب بھی اس کی فنی عظمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ غزل کے سلسلہ میں الفاظ و خیالات کی جن رعایتوں پر قدامہ نے زور دیا ہے ان کو تمام ناقدوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مثلاً ابن رشیق اور مرزبانی وغیرہ نے۔

تشبیہ کا پورا بیان قدامہ نے ارسطو سے اخذ کیا ہے قدامہ کا یہ قول کہ جس تشبیہ میں دونوں چیزوں کا اشتراک صفات میں زیادہ ہو اور باہم انفرادیت کم ہو تو وہ سب سے بہتر تشبیہ ہے یہ تعریف ارسطو کی اس تعریف سے بالکل مطابقت رکھتی ہے کہ استعارہ جس میں ارسطو کے نزدیک تشبیہ بھی شامل ہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تناسب پر قائم ہو اور ایک ہی نوع کی چیز سے ماخوذ ہو[3]۔

---

[1] النقد المنہجی عند العرب ص ۶۵ نقد النثر ص ۱۸-۱۹ [2] النقد المنہجی ص ۱۲۸، ۱۲۹

[3] DE POETICA, TRANSLATED BY INGRAM BYWATER PAGE 1458 - B.

مبالغہ اور غلو کے ذکر میں قدامہ یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ صف اول کے شعراء غلو کی وجہ سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں غلو اچھی شاعری کا خاصہ ہے پھر وہ ان لوگوں کی رائے کی تردید کرتے ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاعر کو غلو کے بجائے اعتدال سے کام لینا چاہئے یہ نظریہ بھی ارسطو سے ماخوذ ہے[1]

پھر اس بحث میں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ جھوٹ شاعری میں جائز ہے یا نہیں دوسرے لفظوں میں صدق و کذب کی بحث میں فن و اخلاق کی بحث شامل ہو جاتی ہے۔ قدامہ نے صاف طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ فن کو اخلاق کے پیمانوں سے ناپنا ٹھیک نہیں مثال کے طور پر انھوں نے امرأ القیس کے بعض فحش اشعار پیش کر کے بتایا ہے کہ اگرچہ اخلاقی اعتبار سے یہ اشعار سقیم ہیں مگر فنی نقطۂ نظر سے بہت اچھے شمار ہونے کے لائق ہیں[2]

یہ نظریہ بھی ہم کو عرب ناقدین کے یہاں ملتا ہے مثلاً صولی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کفر سے شعر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ ایمان سے اشعار میں کوئی اضافہ ہوتا ہے[3]

عرب ناقدین کی تمام اہم کتابوں میں قدامہ کے مذکورہ نظریات موجود ہیں مثلاً ابن رشیق کی کتاب العمدہ، قاضی جرجانی کی کتاب الوساطۃ بین [illegible] وخصومہ وغیرہ ہیں۔

قدامہ کے بعد واضح طور پر عربی تنقید دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک طرف وہ ناقدین نظر آتے ہیں جو یونانی نظریات سے پوری طرح متاثر ہیں اور دوسری جانب وہ ناقدین ہیں جو یونانی خیالات کو پسند نہیں کرتے لیکن بہت سے مسائل وہ انھیں ناقدین سے لیتے ہیں جن کے مخالف ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں ایک ناقد اور سامنے آتا ہے جس کا سارا سرمایۂ فکر و نظر ارسطو کے خیالات ہیں اس نے اپنی پوری کتاب کو یونانی فکر سے رنگ کر پیش کیا ہے۔ یہ کتاب پہلے نقد النثر مصنفہ قدامہ بن جعفر کے نام سے شائع ہوئی تھی مگر یہ تحقیق غلط تھی چنانچہ حسن عبد القادر کو بعد میں ایک

---

[1] DEPOETICA P. 146. — 1460. — نقد النثر ص ۱۹۔

[2] DEPOETICA P. 146. ——— 1461—

[3] النقد المنہجی ص ۷۵۔